غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ خود ان کے پاس اتنا اثاثہ ضرور ہوتا تھا جس سے ایک کم ازکم مدت تک ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گذر بسر ہو سکے۔ العفو کے معانی کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو قرونِ اولیٰ میں واجبات (TAXES) وصول کرتے وقت ملحوظ رکھا جاتا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ واجبات صرف ان لوگوں سے اور اس حد تک وصول کیے جائیں کہ پھر بھی ان کے پاس ان کے لیے اور اہل وعیال کی گذر اوقات کے لیے باقی رہ جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو ہدایات محصلین کو دیں اور جن پر پھر متعلقہ علاقہ کے قابلِ اعتبار افراد سے سال کے سال بالالتزام گواہی لی جاتی تھی وہ اس اصول کے نفاذ کے سلسلہ میں بڑی واضح ہیں۔ گویا اسلامی حکومت اس کی پابند ہے کہ ٹیکس لگاتے وقت اور وصول کرتے وقت العفو کے اصول کی پابندی کرے۔ اور جب اسلامی حکومت کے مصارف روایتی طریقہ (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) سے پورے نہ ہوں۔ اور ان کے علاوہ واجبات یا ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش آئے تو جس کے پاس العفو جتنا زیادہ ہوا تنا اس سے زیادہ وصول کیا جائے اور بالعکس موجودہ زمانے کی اصطلاح میں یہ اصول متزائد ٹیکس، (Progressive Taxation) کے لیے ایک جواز اور بنیاد ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ العفو کی مقدار کا ایک طرف سے تعلق متعلقہ فرد کی ایمانی کیفیت سے ہے (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال، جنگِ تبوک کے موقع پر) اور دوسری طرف یہ تعلق اِن مخصوص حالات سے بھی ہے۔ جس میں سے ملک وقوم اس وقت گذر رہے ہوں ہنگامی قسم کے حالات میں جب قومی اور ملکی ضروریات زیادہ شدید ہوں اور ملت کی بقا خطرے میں ہو۔ العفو کی مقدار کا تعین اور طرح سے کیا جائے گا اور معمول کے حالات میں اور طرح سے۔

(۹) کسب کا سعی کے ساتھ مشروط ہونا

اگرچہ ہمارے بعض مفسرین نے بڑا زور اس امر پر مارا ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ[۵۵] کا اصول معاشی امور میں غیر متعلق ہے لیکن فی الحقیقت یہ کوشش ایک عمومی بیان کو غیر ضروری طور پر اور بے جواز طور پر محدود کرنے کے مترادف ہے اس سلسلہ میں فے اور غنیمت کے احکام کا تقابل واضح کر دیتا ہے کہ اسلام فی الواقع کسب اور سعی کو بالکل غیر متعلق یا باہمدگر بالکل غیر مشروط نہیں سمجھتا۔ "فے" ساری کی ساری بیت المال کا حصہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے حصول میں غازیوں کا کوئی زور نہیں لگا ہوتا۔[۵۶] (مَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ)

---

۵۵ (سورۃ النجم۔ آیت نمبر ۳۹) ۵۶ سورۂ الحشر۔ آیت نمبر ۶۔

اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جس حد تک کوئی مال بغیر سعی کے حاصل ہو اس حد تک وہ بیت المال کی ملکیت ہے موجودہ دور میں گین ٹیکس (Gains Tax) اس اصُول کا ایک اطلاق ہے شوریٰ کے ساتھ کوئی معاشرہ ان دوائر کا تعین کر سکتا ہے جہاں انفرادی سعی کے بغیر ہی کوئی مال حاصل ہو رہا ہو اور اس طرح سے اس خاص حد تک وہ مال کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ بیت المال کی ملکیت ہوگا۔ (بارانی زمینوں کی پیداوار میں عشر کی شرح کا دگنا ہونا نیز دفینہ میں بیت المال کے واجبات کا ۲½ بز کے بجائے ۲۰ بز ہونا۔ اسی اصُول کے اطلاق کی دو اور مثالیں ہیں)

کسب و سعی کو غیر متعلق ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات اسلام کے نظامِ وراثت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے دو باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ایک تو یہ وارث اور مورث دراصل ایک دوسرے کی (خون کے رشتے کے ناطے پر) حیاتیاتی توسیع (Biological Extention) ہی ہوتے ہیں اور ان میں من تو شدم تو من شدی کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک کی سعی دوسرے کی بھی سعی ہوتی ہے (بلکہ دوسرے کے لیے ہی ہوتی ہے اور انفرادی کوشش کے لیے ایک مہمیز یہی خونی تعلق اور اپنے ورثا کو بہتر معاشی حالت میں چھوڑ جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ حیاتیاتی طور پر وہ ایک ہی ہوتے ہیں) اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ وراثت دراصل اسلام کے نظامِ کفالت کی ایک خاص صورتِ حال میں ایک خصوصی شکل ہے۔ ایسے ہی دیگر مستحقین کو جب اسلام کے نظامِ کفالت کے تحت (اس صورت میں اسلامی اخوت کے ناطے یا غیر مسلموں کی صورت میں انسانی بھائی چارے کے حوالے سے) کچھ مال دیا جاتا ہے تو اس سے یہ استشہاد کرنا کہ اسلام میں سعی و کسب غیر متعلق ہیں۔ اسلام کے معاشی فکر کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھنے سے ناکام رہنے کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ——— !

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم

علمی تبحّر، اعتدال اور فقہی توسّع کی حامل شخصیت

(از قلم: حافظ صلاح الدین یوسف، ایڈیٹر "الاعتصام" لاہور)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی، جن کا انتقال رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ (مئی ۱۹۸۵ء) کو کراچی میں ہوا، برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ کے نامور عالم، بلند پایہ مصنّف اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز تھے۔ ان کی علمی و دینی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ، علی گڑھ یونیورسٹی دہلی اور دیگر جگہوں پر مدرس اور لیکچرار بھی رہے۔ صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین، وحی الٰہی، فہم قرآن اور اسلام میں غلامی کی حقیقت جیسی وقیع اور اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور پاک و ہند کے اہم علمی مجلہ "برہان" دہلی کے تقریباً نصف صدی سے مدیر چلے آرہے تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی اور بین الاقوامی اجتماعات میں بھی شریک ہوتے اور اپنے علمی مقالات اور فاضلانہ تقاریر سے اسلام کی نمائندگی اور ملتِ اسلامیہ کی ترجمانی کا فریضہ بھی نہایت اخلاص اور دردمندی سے ادا کرتے رہے۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ ایک متنوع اور بوقلموں شخصیت کے حامل تھے اور اپنی گوناگوں خدمات کی وجہ سے پاک و ہند کی چند نمایاں، ممتاز اور سربرآوردہ شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

تدریسی خدمات کی وجہ سے ان کا حلقۂ تلامذہ و مستفیدین بھی کافی وسیع ہے۔ اور علمی و دینی خدمات کی بنا پر اہل علم و فضل میں بھی خوب متعارف ہیں اور مجھ جیسے کج مج بیان اور ان کے خوانِ علم کے ریزہ چین بیشمار لوگ بھی ان سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے تعلق اور ارادت کے مطابق ان کی بارگاہ میں گُل ہائے عقیدت اور ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کریں گے جس سے یقیناً ان کی سیرت و شخصیت کے نقوش اُجاگر اور ان کی متنوع خدمات کے گوشے واضح ہوں گے جو نسلِ نو کے لیے دلیلِ راہ اور سنگ ہائے میل ثابت ہوں گے۔

راقم خاکسار بھی ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ ایسا پہلو جو راقم کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور شاید اس کی طرف کسی اور کی توجہ گرامی اُس طریقے سے مبذول نہ ہو سکے جس کا وہ مستحق ہے، اور وہ پہلو ہے اختلافی مسائل اور فقہیات میں ان کا اعتدال و توازن، وُسعت و رواداری اور فقہی

جمود سے پاک ہونا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ وہ دیوبند کے فاضل تھے اور آخر دم تک اُس سے وابستہ رہے لیکن اس کے باوجود وہ حنفیت میں اتنے متصلب اور غُلو پسند کبھی نہ رہے جو حلقۂ دیوبند کے وابستگان کا بالعموم طرۂ امتیاز ہے۔ وہ بلاشبہ حنفی تھے اور حنفی رہے لیکن بہت سے مسائل میں انہوں نے حنفیت کے مقابلے میں نصوصِ قرآن وحدیث کو ترجیح دی اور بلا تأمل حنفی فقہ کو نظر انداز کر دیا۔

جس طرح مجلس واحد کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے، اس میں انہوں نے دلائل کی رُو سے حنفی فقہ کے مقابلے میں حافظ ابن القیم اور امام ابن تیمیہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے جس کے حامل پاک و ہند کے اہلحدیث بھی ہیں۔ انہوں نے یہ دلائل اس امر پر زور دیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاقِ رجعی شمار کرنا چاہیئے تاکہ حلالہ جیسے لعنتی فعل اور دیگر معاشرتی خرابیوں سے بچا جا سکے۔ مولانا مرحوم کا یہ فاضلانہ مقالہ — ایک مجلس کی تین طلاق — نامی کتاب[1] میں چھپا ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ دیگر حنفی علماء بھی سنجیدگی سے اس کا مطالعہ فرمائیں اور پورے اخلاص سے اس مسئلے کو اسی تناظر میں دیکھیں جس میں مولانا اکبر آبادی مرحوم نے دیکھا تھا۔

فقہ حنفی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سُود لینا جائز ہے، مولانا اکبر آبادی ۱۹۶۴ء میں مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی کانفرنس میں تشریف لے گئے اور وہاں کے علمی مباحث میں حصہ لیا، جس کی مختصر رُوداد انہوں نے ماہنامہ "برہان" دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ اس کانفرنس میں بنک کے سود پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی اس میں شیخ ابو زہرہ مرحوم نے بنک کے سود کی حُرمت پر بڑی زوردار تقریریں کیں۔ لیکن شیخ نے فقہ حنفی کا مذکورہ مسئلہ بھی اپنی ایک تقریر میں ضمنی طور پر بیان فرمایا اور کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی اور مسلم میں ربٰوا نہیں ہے یعنی وہ جائز ہے۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس سلسلے میں میں نے ایک مختصر تقریر کی اور اس میں کہا کہ اگر امام صاحب کی طرف اس قول کا انتساب صحیح ہے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ جب قرآن میں وَحَرَّمَ الرِّبٰوا عام اور مطلق ہے تو کسی نص یا حدیث متواتر کے بغیر اس کی تخصیص اور تقیید کس طرح جائز اور درست ہو سکتی ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ائمہ اور فقہاء اس بات

---

[1] یہ کتاب پہلے ہندوستان میں چھپی تھی، اس کے بعد لاہور (پاکستان) میں بھی چھپ گئی ہے۔

میں اختلاف کر سکتے ہیں کہ فلاں معاملہ رِبٰوا کے تحت میں آتا ہے یا نہیں ؟ لیکن اگر کسی معاملے کی نسبت یہ ثابت ہو جائے کہ رِبٰوا کی تعریف اس پر صادق آتی ہے تو اب دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ معاملہ جائز ہے۔" ("برہان" دہلی اگست ۱۹۶۵ء ص ۱۱)

اسی طرح حرمتِ مصاہرت اور طلاقِ مکرہ کا مسئلہ ہے جس میں مولانا اکبر آبادی مرحوم نے فقہ حنفی سے اختلاف کیا اور شوافع اور ائمہ ثلاثہ کی رائے کو ترجیح دی ۔ چنانچہ مولانا نے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ایڈووکیٹ کی مرتبہ کتاب "مجموعۂ قوانینِ اسلام" کی جلد اوّل ، دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ۔

"حرمتِ مصاہرت کے باب میں ہمارے نزدیک شوافع کا مسلک عملاً اقرب الی الصواب ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ غایتِ ورع اور تقویٰ کی بات ہے ۔ اسی طرح طلاقِ مکرہ کے معاملے میں ائمہ ثلاثہ کی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔"

("برہان" دہلی ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء ، صفحہ نمبر ۲۴۸)

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس کتاب کی بھی انہوں نے اسی لیے خوب تحسین کی کہ اگرچہ انہوں نے اکثر و بیشتر ائمہ احناف کا تتبع کیا اور ان کی رائے کو ترجیح دی ہے لیکن متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جہاں دوسرے ائمہ کی رائے کو اقرب الی الصواب یا الیسر العمل قرار دیا ہے (حوالہ مذکور)

اسی طرح " دیارِ عرب کے مشاہدات و تأثرات " میں مولانا مرحوم ۔ نے تسمیہ عند الذبح کے مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس کی تائید روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے ۔ (ملاحظہ ہو " برہان" دہلی ۔ فروری ۱۹۶۴ء ، صفحہ ۱۱۴ ۔ ۱۱۵)

عورتوں کا مساجد میں جا کر نماز پڑھنا وغیرہ بھی فقہ حنفی کی رُو سے صحیح نہیں ۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مسلم زنانہ کالج میں جب مسلمان خواتین کے نماز پڑھنے کے لیے وہاں ایک مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا تو بہت سے لوگوں نے اس پر شور مچایا ۔ اس سے متأثر ہو کر ایک سلفی فاضل نے عورتوں کی امامت اور اُنکے مساجد میں نماز پڑھنے وغیرہ پر ایک مدلل مضمون لکھ کر " برہان " میں اشاعت کے لیے بھیجا ، جسے مولانا مرحوم نے نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر ذیل کا نوٹ بھی تحریر فرمایا ۔

"گزشتہ سال مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے مدراس کے ایک مسلم زنانہ کالج میں ایک نہایت شاندار مسجد کا افتتاح کیا تو بعض شورش پسندوں نے اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور انہوں نے کہا کہ عورتوں کے لیے نہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم ہے اور نہ ان کے لیے امامت اور خطبہ دینا جائز ہے ۔ یہ ہنگامہ صرف زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں رہا بلکہ

اُردو کے بعض ذمہ دار اخبارات میں اِس نوع کی تحریریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ اسی واقعے سے متاثر ہوکر ہمارے فاضل دوست مولانا محمد یوسف صاحب (کوکن عمری) نے جو جنوبی ہند کے اکابر علماء میں سے ہیں، پیش نظر مقالے میں اس موضوع پر مفصل اور بصیرت افروز بحث کی ہے جسے ہم شکریے کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔" (بُرہان" دہلی فروری، ۱۹۶۷ء صفحہ ۶۹)

یہ مفصل اور فاضلانہ مقالہ جو "برہان" کے ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، فقہ حنفی کے خلاف ہے لیکن مولانا نے اسے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع فرمایا۔

اسی طرح اپنے مرض الموت میں وہ حنفی فقہ کے برخلاف جمع بین الصلاتین کا اہتمام فرماتے رہے۔
("معارف" اعظم گڑھ، جون ۱۹۸۵ء)

اس مختصر مضمون میں استقصا مقصود نہیں۔ یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئیں ہیں۔ ان مثالوں سے بہرحال ان کے اُس طرز عمل کی نشاندہی ہوجاتی ہے جو ہمارے اس مضمون کا موضوع اور مقصود ہے۔

مولانا مرحوم کا فقہی مسلک، ان کی اپنی تحریرات کے آئینے میں

پھر ان کا یہ طرز عمل کسی اضطراری تاثر یا وقتی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کے اندر فقہی جمود کی بجائے جو توسّع تھا، ان کی فکر ورائے میں جو اعتدال و توازن تھا اور ملتِ اسلامیہ کو درپیش عصری مسائل کے حل کے لیے وہ ولولۂ بیتاب اور جذبۂ صادقہ رکھتے تھے، مذکورہ طرز عمل اس کا مظہر تھا۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ فقہی توسّع اور رواداری اور کسی ایک فقہ پر جمود و اصرار کی بجائے تمام اسلامی فقہی سرمائے سے استفادہ کیے بغیر موجودہ دَور کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل کا حل ممکن نہیں، اس لیے انہوں نے فقہی توسّع کو بطور مسلک اپنایا اور برملا اس کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ وہ بنگلور (جنوبی ہند) کی ایک کانفرنس کی رُوداد لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا ذکر کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کے ہیں۔

(۱) قدامت پرستی (۲) ترقی پسندی (۳) آزاد فکری

اوّل الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا خواہ کوئی مسئلہ یا کوئی معاملہ ہو، بہرحال اس کا حل کسی ایک خاص فقہی مسلک کی روشنی میں ہی تلاش کیا جائے، اور سرِمُو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔
(۲) اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک

کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے، وہ بجائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بناپر کسی جدید مسئلے کا حل اولاً براہ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیئے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ (۳) اب رہا تیسرا رجحان، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا، پھر اپنے لیے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقے سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے۔" ("برہان" دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۳)

اسی طرح ایک اور موقع پر اپنے مسلک اور نقطۂ نظر کی وضاحت مولانا مرحوم اس طرح کرتے ہیں:

"راقم الحروف کا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیوبند کا فیض یافتہ اور جمعیۃ العلماء کا ممبر اور قدردان ضرور ہے۔ لیکن اپنے دل و دماغ کو ہمیشہ کھلا اور آزاد رکھتا ہے اور کبھی کسی مسئلے پر جماعتی عصبیت اور تحزّب کے ساتھ غور نہیں کرتا۔ اس بنا پر دارالعلوم دیوبند ہو یا ندوہ، جمعیۃ العلماء ہو یا اسلامی جماعت، تبلیغی جماعت ہو یا دینی کونسل۔ ان سب اداروں کے اکابر اور کارکنوں کے خلوص، علم و فضل اور اسلامی حمیت و جوش کا دل سے معترف اور قدردان ہے اور یہ جماعتیں جو کام کر رہی ہیں، ان کی اہمیت و افادیت کا منکر نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان جماعتوں کی کسی رائے، کسی طریقِ کار اور یا کسی نظریے سے بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ ایمانداری سے اختلاف ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور اُسے یہ حق استعمال کرنا چاہیئے۔ معاشرے کی شعوری صلاح و فلاح اسی پر موقوف ہے۔ پھر میں جس طرح کسی جماعت کو بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا، اسی طرح کسی شخصِ واحد کو بھی، خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا امام اور شیخِ وقت ہو، تنقید سے ماورا نہیں مانتا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ ارادت و عقیدت ادب و احترام اور تنقید و اختلاف ان کے حدود کیا ہیں اور ان حدود میں رہ کر کس طرح ایک شخص دونوں کے مقتضیات و مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔"

("برہان" دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۶۰۔ از نظرات)

تلفیق بین المذاہب کی حوصلہ افزائی

مولانا مرحوم کا یہی وہ مسلکِ توسّع تھا جس کی وجہ سے وہ ہر اُس دعوت و تحریک کی حوصلہ افزائی

فرماتے جس میں فقہی رواداری ہوتی اور اس کی بنیاد کسی ایک فقہ پر جمود کی بجائے بلا امتیاز تمام فقہی ذخیروں سے استفادے پر ہوتی۔ چنانچہ پاکستان میں ڈاکٹر اسرار احمد بانی تنظیم اسلامی کی بھی انہوں نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بھی اگرچہ حنفی ہی ہیں، مگر ان میں فقہی جمود بہرحال نہیں ہے۔ اور انہوں نے یہ دعوت و تحریک پیش کی ہے کہ فقہ مذاہبِ اربعہ کے ساتھ ساتھ صحیح بخاری کو پانچویں فقہ شمار کر کے اجتہاد و استنباط کا کام کرنا چاہیئے۔ بنیادی طور پر اگرچہ یہ بات صحیح نہیں، اصولاً صحیح بخاری کو قرآن کریم کے بعد فقہ میں اساسی اور اولین حیثیت حاصل ہونی چاہیئے اور اس کی روشنی میں دیگر فقہوں سے استفادہ کیا جانا چاہیئے جس طرح کہ خود مولانا اکبر آبادی کا نظریہ بھی تھا جیسا کہ ان کے ایک اقتباس میں یہ بات گزر چکی ہے۔ تاہم چونکہ ڈاکٹر صاحب کی اس دعوت میں بھی ایک گونہ فقہی جمود سے انحراف تھا، اس لیے اگرچہ بیشتر علمائے احناف نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس دعوت و تحریک کو سخت فتنے اور گمراہی سے تعبیر کیا لیکن مولانا اکبر آبادی مرحوم نے ڈاکٹر صاحب کی تائید کی اور تلفیق بین المذاہب کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

"ہمارے بعض متقدمین علماء نے تلفیق بین المذاہب کو استعمال کیا ہے اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے۔" (ماہنامہ "میثاق" لاہور، اگست ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۴)

مولانا سے مزید سوال کیا گیا کہ "ہمارے بعض علماء تو اس تلفیق کو بہت بڑی گالی خیال کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کے نزدیک (نعوذ) یہ درجۂ کفر تک پہنچی ہوئی بات ہے۔"

مولانا مرحوم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

"ہمارے نزدیک تمام ائمہ فقہا سب برابر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے (تلفیق بین المذاہب) کی ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک نے کی ہے۔ اس (تلفیق) کے بغیر تو چارا ہے ہی نہیں۔ اس کے بغیر ایک صحیح اسلامی ریاست چل ہی نہیں سکتی۔" (ماہنامہ "میثاق" لاہور، صفحہ ۱۴-۱۵، اگست ۱۹۸۵ء)

اسی انٹرویو میں مولانا مرحوم نے تبلیغی جماعت میں بڑھتے ہوئے تحزّب اور اس لحاظ سے بعض بین الاقوامی شخصیات کی اس جماعت سے وابستگی پر اپنے دکھ اور تاسف کا بھی اظہار فرمایا ہے۔

علمائے احناف کے غلو فی الحنفیۃ پر سخت تنقید

مولانا اکبر آبادی مرحوم کے نزدیک فقہی اقوال و آراء کے مقابلے میں نصوصِ قرآن و حدیث کو جو برتری

حاصل تھی، اس کی وجہ سے وہ اُن غالی حنفی علماء کی کاوشوں پر بھی سخت تنقید کرتے جن میں حنفیت کا دفاع ایسے انداز سے کیا گیا ہوتا جس سے نصوصِ شریعت کا تقدس مجروح ہوتا یا اکابر محدثین کی بے توقیری ہوتی یا حدیث کی جمع وتدوین میں ان کی بے مثال کاوشوں اور بے لوث اور غیر جانبدارانہ سعی وجہد پر حرف آتا۔ ذرا دیکھئے! ایسے بعض غالی علماء کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے حق وانصاف کے تقاضوں کو کس طرح ملحوظ رکھا ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی کی عربی کتاب " ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع ابن ماجہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں:۔

" افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جگہ جگہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مخالفین کی بحث اٹھا کر کتاب کو جدل ومناظرہ کا رنگ دے کر اس کی علمی حیثیت کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ خود حدیث کو معرضِ شک وارتیاب میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض محدثین نے امام اعظمؒ کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے، لیکن اس کا جواب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان محدثین پر اس طرح کے رکیک وسخیف حملے کیے جائیں جن سے ان کا کمالِ فن ہی داغ دار ہوجائے۔ اس سلسلے میں امام بخاریؒ، حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ذہبیؒ کی نسبت جو لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ حد یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے متعلق یہاں تک نقل کردیا گیا ہے کہ وہ بربنائے بغض وعناد امام ابوحنیفہ سے روایت نہیں کرتے، لیکن اس کے برخلاف ایسے مستور الحال لوگوں سے روایت کردیتے ہیں جن کے متعلق بخاری جانتے بھی نہیں کہ کون تھے اور کون نہیں تھے؟ (ص ۲۸) اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوشِ انتقام میں صحیح بخاری کے راویوں کی عدالت اور اس کے اُمت کی طرف سے تلقی بالقبول کو متکلم فیہ قرار دے دیا ہے۔ فاضل مصنف خود سوچیں کہ کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو منکرینِ حدیث کہتے ہیں اور کیا امام بخاری کی عدالت، ثقاہت، تقویٰ وطہارت اور ان کی صحیح کی صحت کو مجروح کر دینے کے بعد بھی کسی اور کتابِ حدیث پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض متقدمین حنفیہ نے مجادلانہ طور پر امام بخاری، حافظ ابن حجر، ابن عدی اور حافظ ذہبی وغیرہم کے متعلق اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں۔ لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ علمی امانت ودیانت کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے، اور غیظ وغضب میں کوئی بات ایسی نہ کہے جس سے دین کی اصل بنیاد میں ہی رخنہ پڑ جائے۔ اگر امام بخاریؒ بھی روایتِ حدیث ایسے اہم معاملے میں شخصی رضامندی یا نارضامندی کو دخل